مسئلۂ فلسطین

سامراج اور عالم اسلام

از

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ناشر

دار الرشید

لکھنؤ - الہند

نام کتاب	:	مسئلہ فلسطین، سامراج اور عالم اسلام
مؤلف	:	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
		(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ)
باہتمام		محمد وثیق ندوی
صفحات	:	۴۰
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	۲۵ روپئے
سن اشاعت	:	۱۴۳۲ھ - ۲۰۱۱ء
ناشر	:	دارالرشید، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش گفتار

فلسطین کا مسئلہ کیا ہے؟۔ اس کی نوعیت کیا ہے؟۔ اس کی اہمیت اتنی کیوں ہے؟۔ قدرتی ذخائر سے خالی اس سرزمین سے سامراجی ممالک کو اتنی دلچسپی کیوں ہے؟۔ یہودیوں کے قدم وہاں کیسے جمے؟۔ اثر ورسوخ وہاں ان کا کیوں کر بڑھا؟۔ عیسائیوں نے ان کا ساتھ کیوں دیا؟۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں گستاخی اور حضرت مریم علیہا السلام کی بے حرمتی کے باوجود یہودیوں کے کاندھے سے کاندھا انہوں نے کیوں کر ملایا؟۔ عرب حکمرانوں نے کیا کمزوری دکھائی؟۔ محاذ آرائی سے کنارہ کشی انہوں نے کیوں اختیار کی؟۔ مسلم فوجوں کو پیش قدمی سے کس نے روکا؟۔ پسپائی پر ان کو مجبور کس نے کیا؟۔ انبیاء کی مقدس سرزمین کو بطور تحفہ یہودیوں کے حوالہ کس نے کیا؟۔ اشارہ کس کا تھا؟۔ مجبوری ان کی کیا تھی؟۔ غیرت ان کی کہاں تھی؟۔ کیا اسرائیل واقعی طاقتور ہے؟۔ کیا عالم عربی اتنا ہی کمزور ہے؟ عرب قومیت کا نعرہ کیوں لگایا گیا؟۔ عجم کا اس سرزمین سے رشتہ کیوں کاٹا گیا؟۔ فلسطینیوں کو ہجرت پر کیوں مجبور کیا گیا؟۔ پڑوسی ملکوں نے میزبانی میں اتنی فراخدلی کا مظاہرہ کیوں کیا؟۔

یہ سوالات اگر آپ کے ذہن میں پیدا ہو رہے ہیں اور کیوں نہ ہوں؟،

یہ سرزمین انبیاء کی ہے، انبیاء آپ کے ہیں، توحید کا جو پرچم انہوں نے لہرایا تھا، وہ پرچم آج آپ کے ہاتھ میں ہے، جس نبی پاک ﷺ کی بشارت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام نے دی تھی، اس نبی ﷺ کی پیروکاری کا شرف صرف آپ کو حاصل ہے، جس مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کی کوشش آج کی جارہی ہے، اسی مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے سرکار دوعالم ﷺ نے سولہ ماہ نماز پڑھی ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے آپ ﷺ کو معراج ہوئی، یہی وہ جگہ ہے جہاں آپ ﷺ نے انبیاء کرام کی امامت فرمائی، مسجد نبوی کے علاوہ یہی وہ تیسرا مقام ہے جہاں ایک نماز پر پچاس ہزار نمازوں کے ثواب کا وعدہ ہے۔

کیا آپ اس مقدس مقام کو باغیان خدا، قاتلان انبیاء، اور منکران محمد مصطفیٰ ﷺ کے حوالہ کرنے پر راضی ہیں؟۔ اگر نہیں، تو پہلے آپ اس مسئلہ کو سمجھئے اور پھر آپ جو کچھ کر سکتے ہوں، وہ کیجئے۔ ۴۰ صفحات پر مشتمل مختصر سا یہ رسالہ نہ صرف یہ کہ نہایت ہی کم وقت میں آپ کو اس اہم، نازک اور پیچیدہ مسئلہ سے واقف کرائے گا، بلکہ اس کے وہ پہلو بھی آپ کے سامنے لائے گا جو بہت سوں کی نظروں سے ابھی تک اوجھل ہیں۔

ادارہ اپنے رفیق مولانا محمد وثیق ندوی استاذ ادب وتفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا شکر گزار ہے کہ ان کی کوششوں سے یہ رسالہ مختلف مراحل سے گزر کر آپ کے ہاتھ میں پہونچا۔

جعفر مسعود حسنی ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضرورت قوت ایمانی کی

اس وقت میڈیا پر یہودیوں کا کنٹرول ہے، ہندوستان بھی اس سے مستثنٰی نہیں ہے، پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے بڑے اور معروف اخبارات ورسائل پوری طرح سے یہودی میڈیا کے تابع ہیں اور یہ بات ظاہر بھی ہوجاتی ہے، کوئی مضمون یا خط اگر یہودیوں کے خلاف لکھا جاتا ہے تو اس کو شائع کرنے سے انکار کردیا جاتا ہے، بعض وقت اس کی وجہ بھی بتادی جاتی ہے، لیکن زیادہ تر خاموشی ہی اختیار رکھی جاتی ہے۔ اخباروں میں ایسی خبریں بھی آتی ہیں کہ گویا ہمارے اکثر اخبارات آزاد ہیں اور امریکی اشارہ کے پابند نہیں ہیں، حالانکہ وہ امریکہ کے پیچھے ہیں، کیونکہ خود امریکہ کا پریس یہودیوں کے قبضہ میں ہے اور امریکہ کی گردن یہودیوں کی گرفت میں ہے، انہوں نے میڈیا اور اقتصادیات کے ذریعہ بڑی طاقتوں کو اپنا ماتحت بنالیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم صحیح صورت حال سے واقف نہیں ہوسکتے۔

غزہ کی جنگ (۲۰۰۹ء) میں فلسطینیوں ہی کو ظالم قرار دیا گیا، حالانکہ نقصانات سے ہر شخص اندازہ لگاسکتا ہے کہ ان کا جانی نقصان ایک ہزار سے اوپر

ہوا اور یہودیوں کا نقصان جو بتایا جاتا ہے وہ صرف تیرہ (۱۳) ہے، اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟ پھر جو مالی نقصانات ہوئے، ان کے متعلق خبریں بہت ہی احتیاط کے ساتھ دی جاتی ہیں، جب کہ بڑی تعداد میں ان کے مکانات تباہ ہو گئے، اس وقت بھی سخت سردی کے موسم میں بعض لوگوں کے پاس رہنے کے لئے مکانات نہیں ہیں، ابھی عربی اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی کہ بعض لوگوں کو ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کرنے کے لیے دفتی اور کاغذ لگانے پڑ رہے ہیں، یہ وہ خبریں ہیں جو ہم تک پہنچتی ہی نہیں۔

اس وقت خبریں آرہی ہیں کہ مسجد اقصیٰ کو خطرہ ہے، کوشش کی جارہی ہے کہ مسجد اقصیٰ کو مسمار کر کے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے، اس کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں، کبھی تحقیقات کے نام پر نیچے کھدائی کی جاتی ہے، کبھی مسلمانوں کو اس میں نماز پڑھنے سے روکا جاتا ہے، ابھی خبریں آئیں کہ ان کو نماز پڑھنے سے روک دیا گیا اور اس میں یہودی زبردستی گھس گئے، اس سے پہلے آگ لگانے کی کوشش کی گئی، جس میں ہندوستان میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا اور فسادات ہوئے تھے۔

مسجد اقصیٰ کا مسئلہ صرف عربوں کا مسئلہ نہیں، یہ دنیا کے تمام مسلمانوں کا مسئلہ ہے، فلسطین کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ عربوں کا مسئلہ ہے اور اس میں عربوں کی کوتاہی کو بہت دخل ہے، کیونکہ اسرائیل کا قیام یوں ہی عمل میں نہیں آ گیا، یہودی مکر و فریب ایک حقیقت ہے، لیکن اس مکر و فریب، عیاری و مکاری سے یہودی کوئی بڑا فائدہ نہیں اٹھا سکے، نہ وہ کبھی غالب قوم رہے، ہمیشہ مارے مارے پھرے، دنیا میں کہیں انہیں عزت اور سربلندی حاصل نہیں ہوئی، اگر مکر سے کسی کو فائدہ پہنچتا

تو مکار آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا، بلکہ ایسا نہیں ہے، قرآن مجید کہتا ہے﴿وقد مکروا مکرهم و عند الله مکرهم و ان كان مکرهم لتزول منه الجبال﴾ (اور انہوں نے اپنی چالیں چلیں اور ان کی سب چالیں اللہ کے یہاں ہیں اور وہ چالیں ایسی (غضب کی) تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جاتے) تو مکر سے کچھ نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ برطانیہ بڑا مکار ہے، لیکن حال اس کا اب یہ ہے کہ وجود ہی اس کا خطرہ میں ہے، دولت عظمی (Great Britain) کسی وقت بھی تین حصوں میں بٹ سکتی ہے، اس لیے کہ اسکاٹ لینڈ، آئر لینڈ اور انگلینڈ میں ایسی کشمکش اور ایسی دشمنی ہے کہ اگر ایک علاقہ کا آدمی دوسرے علاقہ میں جاتا ہے تو وہ اس علاقہ کی طرف اپنی نسبت نہیں کرتا، کیونکہ پھر اس کے ساتھ مساوات کا معاملہ نہیں کیا جائے گا، یہ ہے اس ملک کی عصبیت کا حال اور اس کی مالی حالت ایسی ہے کہ اگر عرب اپنا سرمایہ واپس لے لیں، تو برطانیہ ڈھیر ہو جائے، مالی لحاظ سے وہ نہایت کمزور اور سیاسی اعتبار سے اس کی حالت دگرگوں ہے اور سماجی لحاظ سے اس میں جو اخلاقی خرابیاں ہیں وہ سب ہی پر عیاں ہیں، اس لیے مکر سے قومیں زیادہ دن تک کامیاب نہیں رہ سکتی، کچھ دن تک دھوکہ تو دے سکتی ہیں۔

اسرائیل کے قیام کے بہت سے اسباب ہیں، ایک تو یہ ہے کہ اس کو کچھ طاقتور ملکوں نے گود میں لیکر اور عربوں کے ہاتھ پیر باندھ کر ان کے کاندھے پر بٹھا دیا اور اس کے بعد سے اب تک اس کی حفاظت کر رہے ہیں، اس طرح ہوا اسرائیل کا قیام۔ یہ تصور بہت غلط ہے کہ اسرائیل کو برتری حاصل ہے، مثالوں کے ذریعہ آپ کے سامنے یہ بات رکھی جا سکتی ہے، اب تک جتنی بھی جنگیں ہوئیں

ان کا آپ جائزہ لیجئے، اسرائیل کو کامیابی وہیں ہوئی جہاں اس کے مقابل نے کمزوری دکھائی، ابھی حال میں ایک انگریزی کتاب دیکھ رہے تھے، جس میں بہت سے ملکوں کے بارے میں تفصیلات مذکور ہیں، اس کا لکھنے والا مسلمان نہیں ہے، بلکہ اس کا لکھنے والا برطانیہ کا کوئی شخص ہے، بہت پرانی کتاب ہے، اس نے یہ لکھا ہے کہ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام کس طرح ہوا؟ اس نے لکھا ہے کہ یہودیوں کی طاقت بہت کم تھی، جب فلسطین برطانیہ کے قبضہ میں تھا، اسی وقت اس نے طے کرلیا تھا کہ اسرائیل کا قیام یہاں ہوگا تاکہ عربوں پر کنٹرول رہے، یہ برطانیہ کی پالیسی رہی ہے کہ جہاں سے اس کو جانا پڑا وہاں وہ کوئی فتنہ چھوڑ کر گیا تاکہ اس کو بار بار آکر حل کرنے کا موقع ملے، جیسے ایک قصہ ہے کہ ایک شخص نے اپنا مکان بیچا اور مکان خریدنے والے سے کہا کہ مکان تو پورا آپ کا ہے، لیکن اس میں فلاں کمرے میں ایک کھونٹی ہے وہ ہماری رہے گی، اور ہمیں اس کے استعمال کی پوری آزادی ہوگی، خریدنے والے نے سوچا کہ ایک کھونٹی کا معاملہ ہے کوئی حرج نہیں اور اجازت دے دی، اب وہ ہر دوسرے تیسرے دن آتا اور کہتا تھا کہ ہم اس کھونٹی کو دیکھنا چاہتے ہیں، ہم اس میں اپنا کوٹ ٹانگیں گے، آخرکار پریشان ہوکر خریدنے والا اس بات پر مجبور ہوگیا کہ وہ مکان واپس کردے۔

اسی طرح برطانیہ نے یہ کیا کہ جس ملک میں وہ رہا اپنی کھونٹی چھوڑ کر گیا، اور اس کھونٹی کے ذریعہ اس کو موقع ملتا رہا دخل دینے کا اور ان قوموں میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ اس مکان کو پوری طرح سے آزاد کراسکیں یا کھونٹی نکال کر اس کے سر پر ٹھونک دیں اور اس کے بعد کہیں کہ خود بھی جاؤ اور اپنی کھونٹی لے جاؤ،

جب یہ جرأت پیدا ہوجائے گی ان مسلمان ملکوں میں یا ان عرب ملکوں میں جواسرائیل کوجھیل رہے ہیں تواس وقت اسرائیل کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔

۱۹۴۸ء کی جنگ کے بارے میں ایک انگریز مؤرخ نے لکھا ہے کہ اسرائیل کی کوئی فوجی طاقت نہیں تھی، اور چار پانچ عرب ملک اس کے مقابلہ پر تھے، لیکن یہ مقابلہ ظاہری تھا، عرب فوجوں کوحکم تھا نہ لڑنے کا، اور بعد میں جب کچھ اور مجاہدین جوآگے بڑھ گئے اور اسرائیل کے لیے خطرہ بن گئے تھے توان فوجیوں کوحکم دیا گیا فوری واپسی کا اور حکم عدولی کی صورت میں ان کے افسروں کوحکم تھا کہ ان کو شوٹ کردیا جائے۔

۱۹۶۷ء کی جنگ کا بھی حال سن لیجئے، دھوکہ ہی دھوکہ، حکمرانوں نے دھوکہ دیا، فوجوں نے دھوکہ دیا، جنرلوں نے دھوکہ دیا، کیونکہ جو جنرل تھے وہ یا تو برطانیہ کے تھے یا فرانس کے تھے، یا یورپ کے مشیر تھے، ان کولڑنے سے مجبور کردیا گیا، کتاب میں اس نے لکھا ہے کہ عرب تعداد میں زیادہ تھے، لیکن وہ شکست کھا گئے Because they were not united یہ الفاظ اس نے لکھے ہیں ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک غیر مسلم کیسے لکھتا ہے Because they werenot united (وہ متحد نہیں تھے) وہ خائن تھے اور اسی بنیاد پر سارے انقلاب ہوئے۔

مصر کا انقلاب ۱۹۵۲ء میں ہوا، اس کی پہلی جو بنیاد تھی وہ یہی کہ ہمارے ساتھ خیانت کی گئی، ناکارہ اسلحہ کی وجہ سے ہم کوشکست ہوئی، ہم کوخراب اسلحہ دیے گئے، ہم کولڑنے سے روکا گیا، ۱۹۴۸ء کی جنگ اور ۱۹۵۶ء کی لڑائی جب ہوئی، اور نہر سویز کو جمال عبدالناصر نے جب نیشنلائز کیا تو تین ملکوں اسرائیل، فرانس اور

برطانیہ نے مصر پر حملہ کیا اور مصر خطرہ میں پڑ گیا، حالانکہ مصر نے پورا مقابلہ کیا، جمال عبدالناصر اسی وجہ سے ہیرو (Hero) بنے، پھر روس نے مداخلت کی، امریکہ نے ساتھ دیا، امریکہ نے بھی کہا کہ تم لوگ اپنی فوجیں واپس لے جاؤ، روس نے الٹی میٹم (Ultimatum) دیا تو مصر کو فوجیں واپس لے جانی پڑیں، اس جنگ میں اسرائیل فرانس اور برطانیہ کی مدد سے مصر کے اندر تک پہنچ گیا تھا، اور پھر اس نے بڑا قتل عام کیا اور بڑی طاقتوں نے اس کا ساتھ دیا۔

اسی طرح ۱۹۶۷ء کا واقعہ بھی کھلا ہوا ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک رسالہ ''فاستخف قومہ فاطاعوہ'' میں لکھا ہے کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں عرب اور مصری فوجوں کے ساتھ کس طرح مذاق کیا گیا، مصری فوجیں جزیرہ نمائے سینا کو پار کر رہی تھیں اتنے میں اسرائیل کے ہوائی جہاز آتے ہیں اور مصر کے ہوئی اڈوں کو تباہ کر کے چلے جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے اتنی بھی فکر نہیں کی تھی کہ اپنی ہوائی فوجوں کو تیار رکھتے اور اپنے ہوائی اڈوں کی حفاظت کرتے، اور یہی چیز جمال عبدالناصر کے زوال کا سبب بنی، لیکن یہی مصری فوج ۱۹۷۳ء میں بارلیف لائن کو پار کر کے اسرائیل کے اندر داخل ہوگئی اور اسرائیل نے امریکہ سے فریاد کی، یہ تاریخ کا واقعہ ہے، اگر آپ اس تاریخ کے واقعہ کو پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت اسرائیلی قائدین کی کیا حالت ہوئی، انہوں نے امریکہ سے فریاد کی کہ ہم کو بچایئے، ہم گئے، اسرائیل کے اندر مصری فوجیں داخل ہو چکی تھیں، اسرائیل اس وقت پورے خطرہ میں پڑ گیا تھا، چنانچہ امریکہ نے براہ راست مداخلت کی اور جہاں مصری فوج تھی وہاں امریکہ نے اپنی

فوج اتار دی، اور اس طرح اس نے اسرائیل کی حفاظت کی۔

یہی مصری فوج جو ۱۹۶۷ء میں شکست سے دوچار ہوئی تھی اسی شکست خوردہ فوج نے ۱۰ر رمضان کی جنگ میں اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور نہر سویز کو پار کرلیا اور اسرائیل نے اپنی حفاظت کے لئے جو انتظام کیا (سد بنایا) تھا، جسے اسرائیل ناقابل تسخیر کہتا تھا، اور کہتا تھا کہ اس دفاعی لائن کو کوئی پار نہیں کرسکتا، مصری فوج نے نہ صرف اس کو پار کیا بلکہ ان کے ملک کے اندر داخل ہوگئی، جب مصری فوج کو موقع ملا، اور جب ان میں ارادہ اور ایمانی جذبہ پیدا ہوگیا، تو اسی فوج نے جو اس سے پہلے شکست کھا چکی تھی، دشمن کو زیر کرنے میں کامیابی حاصل کرلی، اس کے بعد لبنان میں حزب اللہ سے جو جنگ ہوئی، اور اس کے بعد ۲۰۰۹ء میں غزہ میں جو جنگ ہوئی، اسرائیل نے کہا تھا کہ ہم فیصلہ کن جنگ لڑ رہے ہیں، ہم جب تک فتح نہ کرلیں گے تب تک چھوڑیں گے نہیں، لیکن اسرائیل کو پیچھے ہٹنا پڑا، اور وہ علاقہ محفوظ ہے اور اب بھی محفوظ ہے، اسرائیل نے اس کا محاصرہ کر رکھا ہے، پانی بند کر رکھا ہے، ساری پابندیوں اور دشواریوں کے باوجود فلسطینی قوم جس میں ایمانی جذبہ ہے اس ایمانی جذبہ سے وہ مقابلہ کر رہی ہے، اس لیے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اسرائیل اپنے مکر کی وجہ سے یا فوجی طاقت کی وجہ سے ناقابل تسخیر ہے، قوت ایمانی، اور قوت ارادی جب بھی پیدا ہوگی ان شاء اللہ اس کا وجود مٹ جائے گا چاہے جتنے ملک اس کی حفاظت کریں۔

جب مصر تنہا جیت سکتا ہے، جب حزب اللہ جو شام میں چھوٹا سا گروپ ہے، اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرسکتا ہے، جب غزہ کے گولیوں میں تپے ہوئے

نوجوان اسرائیل کو ناکو چنے چبوا سکتے ہیں تو اسرائیل کو گھیرے میں لئے ہوئے یہ چار پانچ عرب ممالک تو اسرائیل کا نام ونشان مٹا سکتے ہیں۔ اسرائیل کے ایک لیڈر نے حال ہی میں یہ بیان دیا ہے کہ ہمیں ڈر ایٹم بم سے نہیں، ڈر ہمیں ایمانی قوت سے ہے، ہمارے لیے خطرہ یہی اخوانی مجاہدین ہیں، جب ان کو موقع ملے گا یہ ہمارے لیے خطرہ بنیں گے، ہمارے لئے خطرہ ایٹم بم یا فوجی طاقت نہیں۔

اس وقت ضرورت مسئلہ فلسطین سے واقف کرانے اور مسلمانوں میں شعور پیدا کرنے کی ہے، اس لئے کہ واقفیت کے بعد ہی شعور پیدا ہوتا ہے اور شعور کے بعد قوت عمل اور قوت ارادی پیدا ہوتی ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر ''مسئلہ فلسطین، سامراج اور عالم اسلام'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا گیا تھا، جسے حسن البنا شہید اکیڈمی (بھٹکل) نے اپنے ترجمان ''الاخبار'' کے فلسطین نمبر میں شائع کیا تھا، اب احباب کے اصرار پر اسے ایک رسالہ کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے، امید ہے کہ فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔ وما توفیقی إلا باللہ العزیز۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسئلۂ فلسطین

سامراج اور عالم اسلام

سامراجی منصوبے اور عالمی صہیونیت

انیسوی صدی کے اواخر میں حجاز، عراق اور شام کے سلسلہ میں یورپ نے جو سامراجی منصوبے بنائے تھے، آگے چل کر عالم عرب کے سیاسی نقشہ پر ان کے بڑے دوررس نتائج مرتب ہوئے، ان منصوبوں کی پلاننگ اور تنفیذ میں فرانس اور برطانیہ سب سے پیش پیش تھے، اس لیے کہ اس وقت پوری یورپی دنیا میں یہی دونوں ملک سپر پاور تھے، پھر روس، جرمنی اور آخر میں امریکہ بھی اس سامراجی منصوبہ میں شریک ہوگئے۔

مغرب کے ان سامراجی منصوبوں کی تکمیل میں عالمی صہیونیت کا بڑا اہم رول رہا ہے، اس نے یہودیوں سے ہمدردی اور مدد کے جذبات، انسانی، سیاسی اور مذہبی بنیاد پر پیدا کئے، ساری یورپی حکومتیں اپنے یہاں کے یہودیوں کو فراخ دلی کے ساتھ فلسطین بھیجتی رہیں اور فلسطین میں یہودیوں کو بسانے میں ہر طرح کا تعاون اور وسائل بہم پہونچاتی رہیں، پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) کے بعد جب فلسطین خلافت عثمانیہ کے ہاتھوں سے نکل گیا تو ان مغربی حکومتوں نے اپنے قونصل خانوں اور سفیروں کی مدد

سے فلسطین میں زمینیں خرید خرید کر یہودیوں کے حوالہ کرنا شروع کر دیا۔

ترکوں کے ترکہ کی تقسیم کا پلان

پہلی عالمی جنگ میں ترکی کی شرکت اور جرمنی کی مدد کا اس کو خمیازہ بھگتنا پڑا، وہ پہلے ہی سیاسی اور اقتصادی بحران کا شکار تھا اور یورپ کا مرد بیمار کہلایا جاتا تھا، اس کی کمزور پوزیشن کو دیکھکر یورپ کے مسیحی ممالک نے جو ترکوں کے ہاتھوں مسلسل شکست اور ذلت کا سامنا کر رہے تھے، ترکوں کے قبضہ میں رہنے والے ممالک میں بغاوت کرا کے اپنے قبضہ کے امکانات پیدا کیے، ترکوں کے امکانی ورثہ کی تقسیم کا ایک پلان تیار کیا گیا جو برطانیہ کے ایک اخبار میں شائع بھی ہوا تھا، اس میں روس، برطانیہ اور فرانس شریک تھے۔ انتقام کا یہ ایک بہترین موقع تھا، لہٰذا اس سلسلہ میں خفیہ مذاکرات وملاقاتیں ہوئیں، اور جنگ کے بعد کی صورت حال کی منصوبہ بندی کے لیے معاہدے کیے گئے، اگرچہ اس وقت عالمی صہیونی تنظیم کو کہیں استقرار حاصل نہیں تھا، اور اس کے رہنما جرمنی میں پھنسے ہوئے تھے، لیکن دوسری جانب حایم وائزمان (Weizmann, O) نے برطانیہ میں اپنے اثر ورسوخ سے اس کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کر کے اسے ایک طاقتور قیادت عطا کی۔

برطانیہ کی سازش

برطانیہ تین مختلف بلکہ متضاد راستوں اور موقفوں کے ذریعہ شام اور عراق میں اپنے اثر ونفوذ کو بحال رکھنے کے لیے کوشاں رہا، پہلا موقف یہ تھا کہ اس نے عثمانی خلافت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے لیے امیر حجاز شریف حسین بن علی سے گفتگو کی، اور ان سے یہ وعدہ کیا کہ عثمانی سلطنت کی بے دخلی کے بعد جزیرۂ عرب،

شام اور عراق کے اکثر علاقے ان کے زیر قیادت مکمل خود مختاری حاصل کرلیں گے، برطانیہ نے اس موقع پر مبہم اور گول مول پالیسی اختیار کی، حتی کہ یہ طے پایا کہ اس وقت فوری طور پر بغاوت کا اعلان کردیا جائے، بقیہ معاملات جنگ کے خاتمہ کے بعد باہمی مذاکرہ اور رضامندی سے طے کرلئے جائیں گے، لہٰذا اس معاہدہ کے مطابق شریف حسین نے ۱۰ر جون ۱۹۱۶ء کو حجاز میں بغاوت کا اعلان کردیا اور علانیہ طور پر برطانیہ کا حلیف بن گیا۔

سائکس پیکو معاہدہ

دوسری طرف برطانیہ نے عراق اور شام کے مستقبل کے سلسلہ میں فرانس کے ساتھ گفتگو کی (بعد میں اس گفتگو میں روس بھی شامل ہوگیا) اور مئی ۱۹۱۶ء میں سائکس- پیکو معاہدہ (Sykes-picot Agreement) (۱) ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ عراق کا اکثر حصہ، شرق اردن اور فلسطین میں حیفا کا علاقہ برطانیہ کو ملے گا اور لبنان اور شام فرانس کے حصہ میں آئیں گے، فلسطین پر چونکہ متعدد یورپی سامراجوں کی نظر تھی، اس لیے مختلف دعویداروں سے بچنے کے لئے یہ طے کیا گیا کہ اسے کسی ملک کو دینے کے بجائے بین الاقوامی نگرانی میں منتقل کردیا جائے۔

برطانیہ نے چال یہ چلی کہ اس نے فلسطین کے مستقبل کے متعلق عالمی صہیونی تنظیم کے ساتھ خفیہ مذاکرات کیئے، وہ دراصل امریکہ میں یہودیوں کے اثر ورسوخ

---

(۱) یہ معاہدہ فرانس کے نمائندہ جارج پیکو (Georges- Picot) اور برطانیہ کے نمائندہ سر مارک سائکس (Sir Mark Sykes) کے درمیان ہوا، اس لئے اس کو سائکس پیکو معاہدہ کہا جاتا ہے، یہودیوں کی فلسطین میں آبادکاری اور کنٹرول کی یہی بنیاد ہے، یہ معاہدہ ۱۹۱۶ء میں کیا گیا۔

کا استعمال کر کے امریکہ کو اپنی طرف سے جنگ میں شامل کرنا چاہتا تھا۔

صلیبی جنگ کا بھوت اب بھی سوار ہے

پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ اور سلطنت عثمانیہ کے سقوط کے بعد برطانوی فوجیں عرب فوجوں کے تعاون سے ۱۱ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو شہر قدس میں داخل ہوگئیں، برطانوی فوج کا قائد جنرل النبی Allenby تھا اور عربی فوج شاہ فیصل اول کے زیر قیادت تھی، فتح کے بعد برطانوی فوج کے سپہ سالار نے جشن مناتے ہوئے کہا کہ ''آج صلیبی جنگوں کا اختتام ہوگیا'' گویا فلسطین پر ان کا حملہ صلیبی جنگوں کی آخری کڑی تھا، اس جملہ سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ یورپ کے ذہن میں صلیبی جنگوں کا جنون آٹھ سو سال گزر جانے کے باوجود گویا اسی طرح چھایا ہوا ہے جس طرح ۱۱ویں صدی میں قائم ہوا، اور نائن الیون (۹/۱۱) واقعہ کے وقت بش کے منہ سے جو جملہ غیر شعوری طور پر نکل گیا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یورپ پر صلیبی جنگ کا سایہ اب بھی قائم ہے، یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ لوئس نہم نے ۱۲۷۰ء میں اپنی موت کے وقت جو وصیت لکھوائی تھی اس میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ عربوں کے بیچ میں ایک ایسی حکومت قائم کی جائے جو ان کو متحد ہونے سے روکے اور ان کے اندر انتشار اور تفریق پیدا کرے۔

وعدۂ بالفور

۱۹۱۷ء میں عثمانی خلافت کے نمائندہ کی طرف سے شہر قدس جنرل النبی کے سپرد کئے جانے سے پہلے برطانیہ کے وزیر خارجہ بالفور Balfour نے برطانوی حکومت

کی طرف سے صہیونی تنظیم کے نمائندہ لارڈ روتھچیلڈ کے لیے ایک سیاسی بیان جاری کیا جو "وعدۂ بالفور" کے نام سے مشہور ہے، اس بیان میں پوری صراحت کے ساتھ کہا گیا کہ "ملک معظم (His Majesty) کی حکومت پوری ہمدردی اور ذمہ داری کے ساتھ سرزمین فلسطین میں یہودی مملکت کے قیام پر غور کررہی ہے اور ان کی حکومت اس مقصد کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گی" واضح رہے کہ اس اعلان کے وقت فلسطین برطانیہ کے زیرنگیں نہیں تھا۔

برطانیہ کا قبضہ

ستمبر ۱۹۱۸ء میں برطانوی فوجیں شمالی فلسطین پر قابض ہوگئیں اور اکتوبر ۱۹۱۸ء تک انہوں نے شرق اردن، شام اور لبنان پر بھی قبضہ کرلیا، اس وقت سے برطانیہ نے منظّم طور پر عملاً سرزمین فلسطین کو یہودیوں کے حوالہ کرنا شروع کردیا اور برطانیہ فرانس کو اس بات پر راضی کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا کہ سائیکس پیکو معاہدہ میں فلسطین کو بین الاقوامی نگرانی میں دینے کی جو بات طے ہوئی تھی وہ اس سے دست بردار ہوجائے۔

۱۰ر جنوری ۱۹۲۰ء کو برطانیہ کے طاقتور حلیفوں کے اتفاق رائے سے فلسطین کو برطانوی مینڈیٹ (تصرف اور کنٹرول) میں دیدیا گیا اور پھر ستمبر ۱۹۲۲ء میں اقوام متحدہ نے بھی اس فیصلہ کی توثیق کردی۔

برطانیہ کا کردار

بالفور وعدہ کو پورا کرنے کے لیے برطانیہ نے فلسطین پر اپنے تیس سالہ دور اقتدار میں فلسطین میں یہودیوں کی ہجرت اور آمد کے لیے سارے دروازے

کھولے رکھے اور یہودی مہاجرین کو ہر ممکن حمایت اور تعاون فراہم کیا جس کے نتیجہ میں یہودیوں کی تعداد جو ۱۹۱۵ء میں ۸ فیصد یعنی ۵۵ ہزار تھی وہ ۱۹۴۸ء تک ۳۱ فیصد یعنی چھ سو پچاس ہزار ہوگئی، برطانیہ نے اپنے دور اقتدار میں فلسطینیوں کا عرصۂ حیات تنگ کردیا، ان کے لیے کسب معاش کے راستے بھی بند کردیئے، فتنہ وفساد کو ہوادی اور خاندانی اور جماعتی اختلافات کو بڑھاوا دیا اور فلسطینیوں کو آپس میں الجھائے رکھنے کے لیے گھناؤنی سازشیں اور کوششیں کیں، ہائی کمشنروں کو جن میں اکثر یہودی تھے بے انتہا اختیارات دیئے گئے۔

پیل کمیشن

فلسطین کے انقلاب عظیم (۱۹۳۶-۱۹۳۹ء) کے بعد برطانیہ نے پیل کمیشن قائم کردیا جس نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد فلسطین کو یہودی اور عربی دوریاستوں میں تقسیم کرنے اور شہر قدس اور حیفا کو برطانوی مینڈیٹ کے تحت قائم رکھنے کی سفارش کی، لیکن یہودیوں اور عربوں دونوں نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کردیا۔

یہودی پروپیگنڈہ اور امریکی مداخلت کا آغاز

یہودیوں نے دوسری عالمی جنگ کے حالات سے بہت فائدہ اٹھایا اور دنیا کی ہمدردی اور حمایت حاصل کرنے کے لیے جرمنی میں جو واقعات پیش آئے تھے انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور اس بات کا خوب پروپیگنڈہ کیا کہ ان کے لیے دنیا میں کوئی جائے امن نہیں اور ان کی بقا کا واحد راستہ فلسطین میں ان کے لیے قومی وطن کا قیام ہے، انہوں نے یہ بھی پروپیگنڈہ کیا کہ یہودیوں کی مدد عیسائیوں کا مذہبی فریضہ اور انسانی ہمدردی کا تقاضہ ہے، اسی کے ساتھ یہودیوں نے ابھرتی ہوئی عالمی طاقت

امریکہ کو اپنے حق میں لینے کی کوششیں تیز کر دیں، بالخصوص ۱۹۴۲ء میں بلتیمور (Biltemore) معاہدہ کے بعد انہوں نے اپنا رخ پوری طرح امریکہ کی طرف کر دیا اور برطانیہ کے وائٹ پیپر (مئی ۱۹۳۹ء) کو کالعدم کر کے ڈیموکریٹک اور ریپبلکن دونوں پارٹیوں کی تائید اور حمایت حاصل کر لی۔ چنانچہ ۳۱ر اگست ۱۹۴۵ء میں امریکی صدر ٹرومین نے برطانیہ کے وزیر اعظم اٹلی Attlee سے مطالبہ کیا کہ ایک لاکھ یہودی فلسطین بھیجے جائیں۔

اینگلو امریکن کمیٹی

اس وقت کے برطانوی وزیر خارجہ بیون Bevin نے ۱۴ر نومبر ۱۹۴۵ء کو ایک بیان جاری کیا جس میں مسئلہ فلسطین کے حل کے لئے ایک انگلو امریکن کمیٹی کی تشکیل اور اس کی سفارشات کے نفاذ کی دعوت دی گئی تھی، اس طرح امریکہ براہ راست فلسطین کے مسئلہ میں دخیل ہو گیا، اس کمیٹی نے ۱۹۴۶ء میں فلسطینی آراضی کی منتقلی اور یہودیوں کے ہاتھ ان کو فروخت کرنے کی آزادی دے کر ایک لاکھ یہودیوں کی فلسطین میں آبادکاری کی سفارش کی، (۱۹۳۹-۱۹۴۵ء) میں بانوے (۹۲) ہزار یہودیوں نے فلسطین ہجرت کی، اس کے بعد (۱۹۴۶-۱۹۴۸ء) میں اکسٹھ (۶۱) ہزار یہودی مختلف ملکوں سے ہجرت کر کے فلسطین میں بس گئے، اور ۲۷۰ ہزار ایکڑ زمین حاصل کر لی اور ۳۷ نئی کالونیاں بنالیں۔

یہودیوں کے قومی وطن کا قیام

اپریل ۱۹۴۷ء میں یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کے اپنے وعدہ کو پورا کرنے کے بعد برطانیہ نے عرب و یہود کا جھگڑا اقوام متحدہ کی عدالت میں پہونچا

کر اپنا دامن جھاڑ لیا اور فلسطین پر تیس سال تک حکومت کرنے کے باوجود عربوں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں سے آنکھیں بند کر لیں، حالانکہ اسے مینڈیٹ کی دفعات کے مطابق اس بات کی فکر کرنی چاہئے تھی کہ اس کے مینڈیٹ میں فلسطین کے اصل باشندوں کو کسی قسم کا سیاسی، اقتصادی اور تمدنی نقصان نہ ہو۔

مسئلہ فلسطین کے حل کی ناکام کوشش

مئی ۱۹۴۷ء میں جنرل اسمبلی نے Unscop نامی ایک کمیٹی خاص فلسطین کے مسئلہ کے حل کے لیے تشکیل دی تاکہ یہ کمیٹی حالات کا جائزہ لے کر جلد از جلد اپنی رپورٹ پیش کرے، یہ رپورٹ ۳۱ راگست کو تیار ہوئی جس کی غیر منصفانہ سفارشات حسب ذیل ہیں:

(۱) فلسطین میں برطانوی مینڈیٹ کو ختم کر دیا جائے۔

(۲) فلسطین کو عربی اور یہودی دو خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر کے شہر قدس بین الاقوامی برادری کی تحویل میں دیدیا جائے۔

اس کے بعد عالم عرب نے صوفر کانفرنس (۶ رستمبر ۱۹۴۷ء) اور عالیہ کانفرنس (۷ تا ۱۵ ار اکتوبر ۱۹۴۷ء) میں بین الاقوامی کمیٹی کی تجاویز کی مخالفت، افراد اور اسلحہ سے فلسطینی برادران کی امداد اور فوج کو منظّم کرنے نیز فوجی پیش بندیاں کرنے کا فیصلہ کیا۔

اسرائیلی ریاست کا قیام

۲۹ رنومبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنی تاریک ترین قرارداد نمبر ۱۸۱ جاری کر دی، جس کو امریکہ کے دباؤ اور روس کی زبردست حمایت کی وجہ

سے دو تہائی اکثریت سے منظور کر لیا گیا، جس میں فلسطین کو دو مستقل ریاستوں میں تقسیم کر دینے کی بات کہی گئی تھی، جنرل اسمبلی کے اس غیر اخلاقی اور غیر انسانی فیصلہ کی وجہ سے اسرائیلیوں کو فلسطین کا ۵۵ فیصد حصہ مل گیا جب کہ اس سے پہلے وہ ۱۱ر فیصد سے زیادہ کے مالک نہ تھے۔

تقسیم کا یہ فیصلہ فلسطین کے ہر عربی اور مسلمان کے لیے ایک صاعقہ اثر اور روح فرسا حادثہ تھا جس نے مذاکرات اور مصالحت کے ذریعہ فلسطینی حکومت کے قیام کی ہر امید کو بالکل ختم کر دیا، تمام عالم اسلامی میں زبردست مظاہرے ہوئے، ہر ملک کی عوام نے اپنی حکومتوں سے اس غیر منصفانہ تقسیم کو روکنے کا مطالبہ کیا اور فلسطین کو یہودی شکنجہ سے آزادی دلانے کے لیے مسلح جدوجہد کی آواز بھی لگائی گئی، لیکن سب بے سود و بے فائدہ۔

۱۴ر مئی ۱۹۴۸ء کو برطانیہ کی مسلح افواج کے فلسطین سے انخلا کے ساتھ آدھی رات کے وقت برطانوی مینڈیٹ (کنٹرول) ختم ہو گیا اور اسی دن یہودی مملکت کی قومی کونسل نے تل ابیب میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔

فلسطینیوں کا قتل عام اور عالم اسلام کا موقف

فلسطینیوں نے اکتوبر ۱۹۴۸ء کی غزہ کانفرنس میں فلسطین کی عمومی حکومت کا اعلان کر دیا، لیکن وہ عرب ممالک جن کے پاس طاقت تھی اور فوج تھی وہ سرزمین فلسطین پر اپنا کچھ بھی اثر نہ ڈال سکے، اس لئے کہ وہ یورپی ممالک کے مشیروں اور کمانڈروں کے زیر اثر تھے، انہوں نے یہودیوں سے براہ راست ٹکر لینے کے بجائے عرب مجاہدین کی پیش قدمی کو روکنے کا کام کیا، ایسی صورت میں جنگ بندی کرادی

گئی، اور یہودی قبضہ کو قانونی حیثیت حاصل ہوگئی، بلکہ الحاج امین حسینی کو مصری فوج کے دباؤ میں غزہ کو چھوڑنا پڑااور اخوان المسلمین کے جورضا کار جنگ میں شریک ہوئے ان کو قید وبند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں، اور فلسطینی عوام کو خانہ بدوشی، نقل مکانی اور خونریز مظالم کا سامنا کرنا پڑا، جس میں سب سے مشہور ۹/اپریل ۱۹۴۸ء کا "دیریاسین" میں فلسطینیوں کا قتل عام ہے، جس میں ۲۵۸/ فلسطینی شہید ہوئے اور تقریباً ۶۰ فیصد فلسطینیوں کو اپنے وطن سے ہجرت کر کے ان بستیوں میں پناہ لینی پڑی جہاں یہودیوں کی حکمرانی تھی، اس کے علاوہ تقریباً ۳۰ ہزار لوگ فلسطین کے مقبوضہ علاقوں میں پناہ گزیں ہوئے۔

۱۹۵۲ء کا مصر میں جمال عبدالناصر کی قیادت میں انقلاب اسی بنیاد پر ہوا کہ فلسطین میں ہمیں لڑنے نہیں دیا گیااور فلسطین کی آزادی ہمارا پہلا ہدف ہے۔

مصر پر برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کا حملہ

۱۹۵۵ء میں نہر سویز کے نیشنلائزیشن پر مغربی دنیا کا ردعمل یہ ہوا کہ مصر پر برطانیہ فرانس اور اسرائیل نے ۱۹۵۶ء میں حملہ کر دیا، لیکن یہ سہ ملکی حملہ ناکام رہا، کیونکہ امریکا اور سویت یونین نے اس کی تائید نہیں کی جس کی وجہ سے ان مغربی سامراجی ممالک کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، اور ۲۳/دسمبر ۱۹۵۶ء میں برطانوی اور فرانسیسی افواج کا مصر سے انخلا ہو گیا، اور جنگ سویز اپنے اختتام کو پہنچی، مصر نے اپنے مقاصد حاصل کر لئے اور اسرائیل سے اپنا علاقہ واپس لے لیا لیکن اسرائیل کو خلیج عقبہ میں روک نہ سکا۔

برطانیہ کی پوزیشن

اس سامراجی حملہ کے بعد سے برطانیہ کا موقف اسرائیل کے حق میں مکمل

تائید کا ہو گیا، دراصل یہ برطانیہ کی امریکا کی غلامی کا ایک مظہر تھا، برطانیہ کی یہ تائید ۱۹۶۷ء تک جاری رہی، بلکہ برطانیہ اسرائیل کی سیاسی اور فوجی تائید کرتا رہا اور بین الاقوامی سیاست میں اپنی ساکھ کمزور پڑ جانے کے بعد فلسطین میں قیام امن (۱۹۷۳-۱۹۹۴ء) کے امریکی منصوبہ کی تائید کرتا رہا۔

۱۹۶۷ء کی جنگ

جون ۱۹۶۷ء میں مصر نے آبنائے تیران اور خلیج عقبہ کی ناکہ بندی کر دی، اور اسرائیل کے جہازوں کو گزرنے کی اجازت منسوخ کر دی، اقوام متحدہ کے فوجی حفاظتی دستہ کو مصر نے ہٹنے پر مجبور کیا، لیکن ۵ جون کی صبح اسرائیلی ہوائی فوج نے مصر، اردن اور شام کے ہوائی اڈوں کو میزائیل سے تباہ کر دیا، اور ۶ دنوں کے اندر اندر حالات یکسر بدل گئے اور عرب ممالک کو ایک نئے سانحہ کا سامنا کرنا پڑا، اور صہیونیوں نے فلسطین کے بقیہ حصہ (مغربی پٹی کے ۵۸۷۸ کلومیٹر، غزہ پٹی کے ۳۶۳ کلومیٹر، صحرائے سینا کے ۶۱۱۹۸ کلومیٹر اور شام کے جولان پہاڑی علاقہ کے ۱۱۵۰ کلومیٹر رقبہ) پر بھی قبضہ کر لیا۔

اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۳۰ ہزار دوسرے فلسطینی ملک بدر ہوئے، عرب حکمرانوں پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا، آزادی فلسطین کے لیے قومی تحریکات وجود میں آئیں۔

عرب حکومتوں کی ناکامی اور اس کا نتیجہ

عرب حکومتوں کی ناکامی کے بعد فلسطینیوں نے سرفروشانہ اور فدائیانہ کارروائیاں شروع کر دیں، اور صہیونیوں کو جانی اور مالی نقصان پہونچایا، لیکن

اردنی اور فلسطینی دستوں کے درمیان ہونے والے ٹکراؤ نے فلسطینی مزاحمتی تحریک کو نقصان پہونچایا اور کافی حد تک ان کی طاقت توڑ دی اور بعض عرب ملکوں نے فلسطینیوں کے لئے مشکلات پیدا کریں، خود مسلمانوں کے درمیان ہونے والی جنگیں مثلاً ۱۹۸۰ء - ۱۹۸۸ء کی عراق ایران جنگ نے قضیہ فلسطین پر برا اثر ڈالا، اسی طرح ۱۹۷۷ء - ۱۹۸۲ء میں مصر کے جنگ بندی کے معاہدہ میں شامل ہونے کی وجہ سے عالم عربی اور مصر کے درمیان ٹکراؤ کی صورت حال پیدا ہوگئی۔ اس طرح فلسطین کی مزاحمتی تنظیمیں تنہا پڑ گئیں، اور عرب ملکوں نے ان کی کوئی مدد نہیں کی، جبکہ اسرائیل کو سپر پاور کی مکمل تائید وحمایت حاصل رہی۔

۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ

۶/اکتوبر ۱۹۷۳ء میں عرب اسرائیل جنگ کا آغاز ہوا جس میں صہیونیوں کے خلاف مصر کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی، شام ومصر دونوں شریک رہے اور مصریوں نے نہر سویز کے مشرقی حصہ پر قبضہ کرلیا بلکہ سینا تک پہونچ گئے، اکتوبر کی یہ جنگ عربوں کی فتح سمجھی گئی، لیکن مصری صدر انور سادات نے اس جنگ کو مصری مفاد کے خاطر استعمال کیا، بایں طور کہ انور سادات نے نومبر ۱۹۷۷ء میں اسرائیل کا دورہ کیا اور کیمپ ڈیوڈ معاہدہ پر ستمبر ۱۹۷۸ء میں دستخط کیے، جس کی رو سے مصر کی اسرائیل سے مصالحت ہوگئی اور دونوں کے درمیان کشمکش کا خاتمہ ہوگیا، اور مصر نے جزیرہ نمائے سینا کو واپس لے لیا، اس طرح فلسطینیوں نے آزادی فلسطین کے ایک فعال اور طاقت ور رکن مصر کو کھو دیا، جس سے اسرائیل کے خلاف مستقبل میں کسی بھی قسم کی فوجی کارروائی کے امکانات جاتے رہے۔

افغانستان پر روس کا حملہ اور اس کے اثرات

افغانستان پر روس کے حملہ اور قبضہ (۱۹۷۹ء) کے بعد عالم اسلام کی بڑی توجہ فلسطین سے ہٹ کر افغانستان کی طرف مبذول ہوگئی اور اس جنگ کو جس میں امریکہ کی پست پناہی حاصل تھی، جہاد کا نام دیا گیا، اس جہاد کی پوری مدد عالم عربی کے متعدد خلیجی ملکوں نے کی، اس کے بعد عالم عربی میں مسلسل انقلابات ہوتے رہے یا کرائے گئے، جس کی وجہ سے عرب ملکوں کی توجہ قضیہ فلسطین سے ہٹ گئی اور فلسطین تنہا پڑ گیا۔

عرب ملکوں کا معاندانہ رویہ

دوسری طرف عرب ملکوں میں جن باحمیت اور غیرت مند مسلمانوں نے قضیہ فلسطین کی مدد کی کوشش کی ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، جیلوں میں ڈال دیا گیا، اسلام پسند عنصر کو بالکل کچل دیا گیا، خصوصاً شام، اردن اور مصر میں اخوانیوں کو جو فلسطینیوں کی مدد اور حمایت کر رہے تھے، جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا، اس وجہ سے فلسطینی ہر طرح کے تعاون اور مدد سے محروم ہو گئے، جبکہ اسرائیل سامراجی طاقتوں کی مدد اور عربوں کے خفیہ معاہدوں کی مدد سے اپنی طاقت بڑھاتا اور فلسطینیوں پر مظالم کے پہاڑ توڑتا رہا۔

انتفاضہ تحریک

۹ر دسمبر ۱۹۸۷ء میں انتفاضہ تحریک شروع ہوئی، ۱۹۹۳ء تک یہ تحریک پوری طاقت کے ساتھ سرگرم رہی، اور انتفاضہ کے ساتھ ہی حماس کا قیام بھی عمل میں آیا،

جس نے اپنے مؤسس اور انتفاضہ کے روح رواں شیخ احمد یاسین شہید کی قیادت میں بہت زیادہ عوامی مقبولیت حاصل کی۔ اس وقت تنہا حماس ہی اسرائیلی جارحیت کا مقابلہ کررہا ہے، الفتح جو مزاحمت کے لئے قائم ہوئی، متعدد معاہدوں کی رو سے اسرائیل کی معاون ہوگئی ہے اور اکثر عرب حکومتوں کی تائید اسی کو حاصل ہے، غزہ کا حصار اور اسرائیلی حملہ کے دوران یہ بات کھل کر سامنے آگئی، عالم اسلام قضیہ فلسطین سے الگ ہوگیا ہے، اور بعض حلقوں نے اس کو صرف عربوں کا قضیہ بنادیا ہے، جس کی وجہ سے فلسطین عالم اسلام کی تائید سے محروم ہورہا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد کے حالات

۱۹۸۰ء کے اواخر اور نوے کے اوائل میں عربی اور بین الاقوامی پیمانہ پر ایسی تبدیلیاں وجود میں آئیں جن سے فلسطینی اور عربی موقف میں کمزوری پیدا ہوئی، خاص طور پر ۲ راگست ۱۹۹۰ء میں کویت پر عراقی حملہ سے عربی قوت تتر بتر ہوگئی، نتیجۃً خود عرب ممالک میں دشمنانہ ماحول قائم ہوا اور عراق کی فوجی قوت، عربی ذخائر اور درآمدات میں کمی آئی، عراقی حملہ اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی خلیجی جنگ کے نتائج مسئلہ فلسطین کے حق میں بڑے اندوہناک ثابت ہوئے اور کویت کی مدد سے محروم ہوگیا۔

سویت یونین کا سقوط

اسی وقفہ میں امریکہ بھی سویت یونین کے زوال اور خصوصاً ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کے بعد دنیا کی سب سے بڑی قوت بن کر سامنے آیا، سرزمین فلسطین میں یہودیوں کے اثر ورسوخ سے حالات مزید ابتر ہوتے گئے، بالآخر اکتوبر ۱۹۹۱ء میں میڈریڈ کی عرب اور اسرائیل کانفرنس میں عرب ممالک کو کھینچ لانے میں امریکہ کامیاب ہوگیا،

جس کے بعد براہ راست عرب اور اسرائیل مذاکرات کے سلسلہ کا آغاز ہوا۔

اوسلو معاہدہ

۲ سال کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان اوسلو معاہدہ کا اعلان کیا گیا، اور ۱۳ر ستمبر ۱۹۹۳ء میں امریکی صدر بل کلنٹن، یاسر عرفات اور اسحٰق رابین کی موجودگی میں سرکاری طور پر دستخط کئے گئے، فلسطینیوں کی جانب سے محمود عباس نے اور اسرائیل کی جانب سے اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیرز نے دستخط کئے، روس اور امریکہ کے وزیر خارجہ نے بحیثیت مشاہد دستخط کئے، اس کے بعد مختلف معاہدہ ہوئے جس میں بنیادی طور پر صہیونی مفادات کا خیال رکھا گیا اور فلسطینی حکومت جو اوسلو معاہدہ کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی وہ حساس مسائل کے حتمی فیصلہ تک پہونچنے میں ناکام رہی۔

عالم اسلام کی موجودہ صورت حال

قضیہ فلسطین کے مذکورہ بالا تاریخی جائزہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسرائیل کے قیام اور اس کے استحکام میں مغربی سامراج، عربوں کا افتراق، عرب حکام کی بے توجہی اور بروقت فلسطین کی حفاظت کی کارروائی نہ کرنا اور فلسطینی مزاحمتی تحریکوں کو مدد اور وسائل بہم نہ پہونچانے کا کلیدی رول رہا ہے، مصر کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کے بعد سے اسرائیل کے ساتھ مفاہمت کے رویہ پر عمل کر رہا ہے اور مزاحمت کرنے والے عناصر کی مخالفت بلکہ ان کے خلاف اسرائیلی کارروائی کی تائید پر عامل ہے، جیسا کہ غزہ کے حصار کے سلسلہ میں اس کے رویہ سے ظاہر ہوتا ہے، عالم اسلام کے دوسرے ممالک جو اسرائیل کے خلاف کوئی مؤثر رول ادا کر سکتے ہیں، وہ ایسے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں کہ ان کو اپنی سلامتی اور بقا کی فکر دامن گیر ہے، ترکی کے تعلقات

عربوں کی بغاوت اور خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد عربوں کے ساتھ عدم تعاون کے رہے، اس کے مقابلہ میں اس کے اسرائیل سے قریبی تعلقات تھے، موجودہ حکومت نے جو اسلام پسند ہے، اس نے کچھ عربوں سے ہمدردی کا رویہ اختیار کیا، مگر وہ نیٹو کے ممبر ہونے اور یورپین کمیونٹی میں داخل ہونے کی کوشش کی وجہ سے اہم رول ادا نہیں کرسکتا، پاکستان، ایران، سوڈان حالت جنگ میں ہیں، بعض ملکوں کی اسرائیل سے خفیہ مفاہمت ہے۔

اسرائیل کی یورپین حمایت

اس کے مقابلہ میں پوری یورپی دنیا کھل کر اسرائیل کی تائید کرتی رہی، اس کا مظاہرہ ۱۹۱۸ء میں ہوا، اور اس کے بعد ۲۰۰۹ء میں غزہ پر اسرائیلی ناکہ بندی اور ہوائی حملوں کے دوران کھلے طور پر ہوا، بلکہ اس سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ حماس کی مدد کے بجائے بعض ملکوں نے ان کی مخالفت کا رویہ اختیار کیا، اور اسرائیل کے ساتھ خفیہ طور پر تعاون کیا، یہ قضیہ پوری طرح عربی قضیہ ہی نہ بن سکا، چہ جائیکہ عالم اسلام کا قضیہ بنتا۔

یورپی دنیا کی اسرائیل کی حمایت اور مدد کا اندازہ درج ذیل بالفور کی دستاویز سے لگایا جاسکتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:-

> ''صہیونیوں کے تعلق سے چار ممالک نے اپنے وعدے بخوبی پورے کیے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صہیونی خواہ وہ حق پہ ہوں یا باطل پر اور خواہ وہ اچھے ہوں یا برے ہماری تہذیب اور ہماری موجودہ ضرورت اور ہماری مستقبل کی آرزوؤں کی تکمیل میں ان کا اہم رول ہے وہ عرب ممالک میں آباد ۷۰۰ ہزار عربوں کی خواہشات سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں''۔

ملک عبدالعزیز کے ایک خط کے جواب میں جس میں انہوں نے مسئلہ فلسطین کے تعلق سے امریکی موقف پر اپنے خدشہ کا اظہار کیا تھا امریکی صدر ٹرومان نے کہا: "امریکا اپنے موقف پر اٹل ہے، وہ یہ کہ عوام کو ان کی حکومت دی جائے گی اور فلسطین میں یہودیوں کی باز آبادکاری بھی ضروری ہے"

۲۷/اکتوبر ۱۹۹۴ء میں امریکی صدر بل کلنٹن نے اپنے اسرائیلی دورہ میں اسرائیل پارلیمنٹ میں یہ بیان دیا تھا کہ "تمہارا زوال ہمارا زوال ہے، امریکا اب بھی تمہارے ساتھ ہے اور آئندہ بھی رہے گا"۔

ایسی صورت حال میں کسی نصرت غیبی کا انتظام ہو جائے تو مسئلہ فلسطین حل ہو سکتا ہے۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

حسن انجام اہل حق کے ساتھ وابستہ ہے

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

"غلبہ اور فتح انشاء اللہ اہل حق کی اور انسانیت کے لئے عمومی اور ابدی پیغام رکھنے ولی ملت ہی کی ہوگی، جس کی شفقت میں پوری انسانیت کا حصہ ہے، جس کی نظر میں ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، جو حق کے لئے ہر جگہ سینہ سپر ہو جاتی ہے اور ظلم کا مقابلہ ہر موقع پر ہر شکل میں ہر جگہ کرتی ہے، جو انسانیت کی خدمت کے لئے زندہ ہے اور انسانیت ہی کے ساتھ وابستہ ہے، جس کا دامن فتنہ وفساد سے پاک ہے اور جو دنیا میں علو وفساد کی نہیں، حق وانصاف کی علمبردار ہے"۔

(عالم عربی کا المیہ، ص:۱۸۳)۔

مسئلہ فلسطین

برطانوی دستاویزات کی روشنی میں

☆10/8/1840 کو برطانوی وزیر اعظم پلمرسٹون (Palmerston) نے ترکی میں تعینات برطانوی سفیر کو ایک خط بھیجا کہ:۔

''یورپ کے مختلف شہروں میں رہنے والے یہودیوں میں یہ احساس بڑھ گیا ہے کہ اب فلسطین میں اپنا وطن قائم کرنے کا وقت قریب آ گیا ہے اور یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ یورپ کے یہودی بڑے دولتمند ہیں، لہذا جب یہودی قوم عثمانی بادشاہ کی سرپرستی اور حمایت میں فلسطین واپس آ جائے گی تو یہ محمد علی اور ان کے جانشینوں کے خطرناک پلان کے نافذ العمل ہونے کے راستہ میں رکاوٹ بنیں گے اور ترکی حکومت بھی اس کو مسئلہ فلسطین کے حق میں مفید سمجھتی ہے کہ اس طرح کے ایک معمولی قانون کے ذریعہ وہ بہت سے ملکوں میں اپنے حمایتی اور دوست حاصل کر سکتی ہے۔(۱)

☆1861 میں برطانوی قلم کار تھامس کلارک (Thomas Clark) نے اپنی کتاب ''ہندوستان اور فلسطین'' میں لکھا کہ: ''اگر یہودی قوم کو دوبارہ کھڑا کر دیا جائے تو عنقریب بنی اسرائیل میں بیداری اور حرکت پیدا ہو جائے گی،

اوراس سے سب زیادہ فائدہ ہم کوحاصل ہوگا۔ یہ یقین رکھنا چاہیے کہ فلسطین میں یہودی وطن کا قیام از حد ضروری ہے، اگر برطانیہ تجارت کو اپنی ریڑھ کی ہڈی سمجھتا ہے اور اسے معلوم ہے اس کی تجارت تین براعظموں سے ہوکر گزرتی ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ یہودی بنیادی طور پر ساہوکار اور تاجر قوم ہے تو اسے اپنی تجارت کی ترقی اور فروغ کے لئے بنی اسرائیل کو فلسطین میں بسانا انتہائی ضروری ہے، از سر نو انہیں ان کی قومیت اور ان کا ملک واپس کردیا جائے، کیونکہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو ان سے نہیں چھین سکتی''۔(۲)

☆13/3/1916 کو سابق روسی دارالسلطنت پٹروگراڈ(Petrograd) میں قائم برطانوی سفارت خانہ نے روسی وزیر خارجہ کو ایک خط لکھا تھا جس میں فلسطین میں یہودیوں کے قیام سے متعلق روس کی رائے جاننی چاہی تھی۔اس خط میں سر اوداورڈ گری نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ اس وقت برطانیہ کے بادشا سلامت فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری پر بھرپور توجہ دے رہے ہیں، خط میں پیش کیا گیا نقطۂ نظر اگر صحیح ہے تو صہیونیت کے ذریعہ اہم سیاسی نتائج برآمد ہوں گے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح مشرق اور امریکہ کے یہودیوں کو اپنے حلیفوں کی طرف لایا جاسکتا ہے۔(۳)

☆2/11/1917 کو برطانیہ کے وزیرخارجہ بالفورBalfour نے وعدہ کیا کہ ''ملک معظم (His Majesty) کی حکومت پوری ہمدردی اور ذمہ داری کے ساتھ سرزمین فلسطین میں یہودی مملکت کے قیام پر غور کررہی ہے اوران کی حکومت اس مقصد کے حصول کے لیے ہرممکن کوشش کرے گی اور ہرایسے کام سے گریز

کرے گی جس سے فلسطین میں رہنے والی غیر یہودی آبادی کے شہری اور مذہبی حقوق متاثر ہوں یا دوسرے ملکوں میں رہنے والے یہودیوں کے حقوق اوران کی سیاسی پوزیشن متاثر ہو۔(۴)

☆ بالفور 1/8/1919 کوکینج کراین امریکی کیمشن کوایک خط میں لکھتا ہے کہ:

''صہیونیوں کے تعلق سے چار ممالک نے اپنے وعدے بخوبی پورے کیئے، اوراس میں کوئی شک نہیں کہ صہیونی خواہ وہ حق پر ہوں یا باطل پر اور خواہ وہ اچھے ہوں یا برے، ہماری تہذیب، ہماری ضرورت اور مستقبل کی ہماری آرزوؤں کی تکمیل میں ان کا اہم رول ہے۔ وہ عرب ممالک میں آباد ۷۰۰ ہزار عربوں کی خواہشات سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں''۔(۵)۔

☆ 20/4/1920 کو جب دوست ممالک کی کونسل نے فلسطین میں برطانوی مینڈیٹ کومنظوری دے دی تو اس وقت شاہ برطانیہ نے یہودیوں کے نام ایک پیغام میں کہا کہ ''تمام دوست ملکوں نے یہ فیصلہ اور عہد کرلیا ہے کہ تدریجی طور پر فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کو یقینی بنایا جائے گا''۔(٦)

حوالہ جات

(۱) ملف وثائق فلسطين "موف"۔ الهيئة المصرية العامة للاستعملامات، ٤٨ ۔

(۲) بحوالہ سابق:۵۳۔(۳) بحوالہ سابق:۱۹۱(۴) بحوالہ سابق:۲۱۷۔(۵) بحوالہ سابق:

۲۵۷۔(٦) بحوالہ سابق:۲۷۵

مسئلہ فلسطین

امریکی دستاویزات کی روشنی میں

☆ امریکی ماہرین کے ایک کمیشن نے امریکی صدر ولسن Wilson کو 12/1/1919 کو اپنی مفصل رپورٹ پیش کی کہ:۔

''کمیشن سفارش کرتا ہے کہ برطانوی مینڈیٹ میں فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن قائم کر دیا جائے اور دنیا بھر کے یہودیوں سے اپیل کی جائے کہ وہ فلسطین میں آکر بسیں اور انہیں ہر طرح کا تعاون بہم پہونچایا جائے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھا جائے غیر یہودی باشندوں کے حقوق متأثر نہ ہوں''۔(۱)

☆ کینج کراین امریکن کمیٹی نے فلسطین کے زمینی سروے کے بعد 28/81919 کو رپورٹ پیش کی جس میں صراحت کے ساتھ کہا گیا کہ:۔

''فلسطین کی اصل غیر یہودی آبادی جو نوے فیصد ہے فلسطین میں صہیونی پروگرام کو قبول نہیں کرے گی اور یہ بات بھی واضح ہوگئی ہے کہ صہیونیوں اور یہودیوں سے عداوت کا احساس اب صرف فلسطین ہی میں محدود نہیں رہا، تمام انگریز افسروں کا ماننا ہے کہ صہیونی پروگرام کو صرف اور صرف فوجی طاقت ہی کے بل پر نافذ کیا جاسکتا ہے، اور یہ فوجی طاقت پچاس ہزار فوجیوں سے کم نہ ہو،

یہ خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صہیونی پروگرام میں اصل فلسطینی باشندوں کے حقوق کی کھلی پامالی ہے، لہذا ان ظالمانہ قراردادوں کے نافذ کرنے کے لئے فوج کو بھیجنا ضروری ہے، دوسری طرف صہیونیوں کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ وہ فلسطین میں دو ہزار سال سے آباد ہیں، یہ دعوی نا قابل توجہ ہے، جو لوگ فلسطین کو یہودی ریاست بنانا چاہتے ہیں انہیں نتائج کا صحیح اندازہ نہیں ہے اور نہ انہیں فلسطین میں پائی جانے والی مخالفت اور عداوت کا اندازہ ہے، خاص طور پر دنیا کے ان حصوں میں جہاں کے لوگ فلسطین کو مقدس سرزمین سمجھتے ہیں، بالفاظ دیگر فلسطین میں یہودیوں کی ہجرت کو یقینی بنایا جائے اور فلسطین کو یہودی اسٹیٹ بنانے کے منصوبہ سے کلی طور پر گریز کیا جائے"۔(۲)

☆16/3/1944 کو امریکی صدر فرانکلین روزولٹ (Roosevelt) نے اپنے ایک بیان میں کہا:۔

"آج مجھے بڑی سعادت محسوس ہو رہی ہے، اس لئے کہ یہودی پناہ گزینوں کے لئے آج فلسطین کے دروازے کھول دئے گئے ہیں، مستقبل میں جب اہم فیصلے کر لئے جائیں گے تو ان لوگوں کو انصاف مل جائے گا جو یہودیوں کے قومی وطن کے لئے کوشاں ہیں، ہماری حکومت اور امریکی قوم دونوں اس کو محسوس کرتے ہیں، اور آج تو کچھ زیادہ ہی اس کا احساس ہے"۔(۳)

☆دسمبر ۱۹۴۵ء کو یورپ کے یہودیوں کے مسائل اور مسئلہ فلسطین پر غور کرنے کے لئے جو انگلو-امریکن کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس کی سفارشات میں کہا گیا کہ:۔

"فوری طور پر ان یہودیوں کو فلسطین میں داخلہ کی اجازت دے دی جائے جو نازیوں اور فاشسٹوں کے مظالم کا شکار بنتے رہے ہیں۔

اس مقصد کے حصول میں امریکہ اور برطانیہ دونوں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

فلسطین کو یہودی اور فلسطینی ریاست میں تقسیم نہ کیا جائے، ایسے اقدامات کئے جائیں جن سے یہودی، مسیحی اور اسلامی حقوق کی حفاظت کو یقینی بنایا جا سکے۔

یہودیوں کو اپنے ملک اور قومی یہودی وطن سے تعلق رہا ہے، اگرچہ ان کی تعداد بہت کم رہی ہے، لیکن اب یہ حقیقت بن گیا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ فلسطین خالص یہودی سرزمین نہیں ہے، اور نہ مستقبل میں ایسا ہو سکتا ہے، یہ عالم عربی کے دوراہ پر ہے اور عرب جن کے اسلاف یہاں کے قدیم زمانے سے اصل باشندے ہیں وہ اس کو اپنا قومی وطن سمجھتے ہیں۔

عرب اور یہود دونوں سے صاف لفظوں میں کہہ دیا جائے کہ اگر کسی نے بھی تشدد کا راستہ اختیار کیا یا غیر قانونی فوج بنائی تو اسے کچل کر رکھ دیا جائے گا۔"(۴)

☆ ملک عبدالعزیز کے ایک خط کے جواب میں جس میں انہوں نے مسئلہ فلسطین کے تعلق سے امریکی رویہ پر اپنے خدشہ کا اظہار کیا تھا امریکی صدر ٹرومان (Truman) نے کہا: "امریکا اپنے رویہ پر اٹل ہے، وہ یہ کہ عوام کو ان کی حکومت دی جائے گی اور فلسطین میں یہودیوں کی بازآبادکاری بھی ضروری ہے"۔(۵)

☆24/2/1957 کو منعقد ہونے والی یہود و نصاری کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے امریکی صدر جان کنیڈی (Kennedy) نے کہا کہ:۔

''مجھے یقین ہے کہ عرب اور یہود دونوں شہری دوستی پر متفق ہو جائیں گے، اور اس راستہ میں داخلی سطح پر دونوں کو جس ملامت اور تنقید کا سامنا کرنے پڑے گا اس کو برداشت کریں گے، اور جنگ کے راستہ کو چھوڑ کر تمام کوششوں اور مالی وسائل کو تعمیری رخ پر لگائیں گے۔ اسرائیل ایک تیز روشنی ہے جو شرق اوسط میں پھوٹ رہی ہے''۔(۶)

☆ ۲۷/اکتوبر ۱۹۹۴ء کو امریکی صدر بل کلنٹن نے اپنے اسرائیلی دورہ میں اسرائیلی پارلیمنٹ میں یہ بیان دیا کہ ''تمہارا زوال ہمارا زوال ہے، امریکا اب بھی تمہارے ساتھ ہے اور آئندہ بھی رہے گا''۔(۷)

حوالہ جات

(۱) ملف وثائق فلسطين "موف"۔ الهيئة المصرية العامة للاستعملامات، ۲۴۱۔

(۲) بحوالہ سابق: ۲۵۹۔ (۳) بحوالہ سابق: ۳۵۷

(۴) بحوالہ سابق: ۶۵۷۔ (۵) بحوالہ سابق: ۸۵۹ (۶) بحوالہ سابق: ۱۵۶۱۔ (۷) صحیفہ

مصادر ومراجع

١ـ كيف يفكر زعماء الصهيونية / أمين هويدى، دار المعارف القاهرة، ١٩٧٥م.
٢ـ وثائق فلسطينية / الهيئة العامة للاستعلامات، وزارة الإرشاد القومي، القاهرة، ١٩٦٩م.
٣ـ القضية الفلسطينية في أربعين عاماً / مركز دراسات الوحدة العربية، بيروت، الطبعة الأولى، ١٩٨٩م
٤ـ قضيه فلسطين / د. صلاح العقاد، معهد الدراسات العربيه والعالمية، جامعة الدول العربية، ١٩٨٦م
٥ـ فلسطين: تاريخاً وعبرة ومصيراً / شفيق الرشيدات، مركز دراسات الوحدة العربية، بيروت، ١٩٨١م
٦ـ حق الفلسطينيين في تقرير المصير / الأمير الحسن بن طلال.
٧ـ البعد الديني في السياسة الأمريكية تجاه الصراع العربي الإسرائيلي / د. يوسف الحسن، مركز دراسات الوحدة العربية، بيروت، ١٩٩٠م.
٨ـ الاستراتيجية الإسرائيلية (١٩٦٧ – ١٩٨٠م) / د. غازي إسماعيل ربايعة، مكتبة المنار، الأردن، ١٩٨٢م.
٩ـ السادات وكامب ديفيد / د. صلاح العقاد، مكتبة مدبولي، القاهرة، ١٩٨٤.
١٠ـ تقييم سياسي لمقررات كامب ديفيد / محمد إبراهيم كامل، بيروت، مؤسسة الرسالة، ١٩٩٧.
١١ـ اتفاق التحالف الاستراتيجي الأمريكي الإسرائيلي، المستقبل العربي / مركز دراسات الوحدة، العربية، عدد ٦٣، مايو ١٩٨٤م.

١٢- من يساعد إسرائيل؟ / د/ جودة عبد الخالق، دار المستقبل العربي، القاهرة، ١٩٨٥م.
١٣- لعبة الأمم في الشرق الأوسط / أمين هويدي، دار المستقبل العربي، القاهرة، ١٩٩٠.
١٤- تاريخ فلسطين الحديث / عبد الوهاب الكيالي، بيروت، المؤسسة العربية للدراسات والنشر، ١٩٨٥.
١٥- سياسة الانتداب البريطاني حول أراضي فلسطين العربية / محمد سلامة النحال، بيروت، منشورات فلسطين المحتلة، ١٩٨١.
١٦- فلسطين والانتداب البريطاني ١٩٢٢-١٩٣٩م / كامل خلة، ليبيا، ١٩٨٢.
١٧- التيار الإسلامي في فلسطين وأثره في حركة الجهاد ١٩١٧-١٩٤٨م / محسن محمد صالح، الكويت، ١٩٨٨م.
١٨- القيادات والمؤسسات السياسية في فلسطين١٩١٧- ١٩٤٨م / بيان الحوت، بيروت، مؤسسة الدراسات الفلسطينية، ١٩٨١.
١٩- الموسوعة الفلسطينية / إشراف: أحمد المرعشلي، دمشق، ١٩٤٨م.
٢٠- الطريق إلى القدس / محسن صالح، لندن، فلسطين المسلمة، ١٩٩٨م.
٢١- فلسطين والمزاعم اليهودية / أسماء فاعور، بيروت، دار الأمة، ١٩٩٥م.
٢٢- المنظمة الصهيونية العالمية / أسعد عبد الرحمن، بيروت، المؤسسة العربية للدراسات والنشر، ١٩٩٠م.
٢٣- فلسطين عبر ستين عاماً / أميل الغوري، بيروت، دار النهار للنشر، ١٩٧٢م.
٢٤- ألف يوم مع الحاج أمين الحسيني / زهير المارديني / بيروت، ١٩٨٠م.
٢٥- القوات العسكرية والشرطة في فلسطين / محسن صالح.
٢٦- النكبة: نكبة بيت المقدس والفردوس المفقود / عارف العارف، بيروت، المكتبة العصرية.
٢٧- فلسطين بلا هوية / صلاح خلف، عمان، دار الجليل للنشر، ١٩٩٦م.

٢٦ـ النكبة: نكبة بيت المقدس والفردوس المفقود/عارف العارف، بيروت، المكتبة العصرية۔
٢٧ـ فلسطين بلا هوية/ صلاح خلف، عمان، دار الجليل للنشر، ١٩٩٦م۔
٢٨ـ مشاريع التسوية للقضية الفلسطينية/ منير الهور وطارق عيسى، عمان، دار الجليل للنشر، ١٩٨٦م۔
٢٩ـ الانعكاسات السياسية لاتفاق الحكم الذاتي الفلسطيني/ عماد يوسف،عمان، ١٩٩٥م۔
٣٠ـ الهجرة اليهودية حقائق وأرقام/عمران أبو صالح، عمان، دار الجليل للنشر، ١٩٩١م۔
٣١ـ تاريخ مدينة القدس/رفيق النشتة وإسماعيل ياغي، عمان، دار الكرمل، ١٩٨٤م۔
٣٢ـ القضية الفلسطينية، خلفياتهاوتطوراتها حتى سنة ٢٠٠١م/ د/محسن محمد صالح، مركز الإعلام العربي، الجيزة، مصر، ٢٠٠٢م۔
٣٣ـ مجلة "المجتمع" الكويتية، الأعداد: ١٨٠٢ — ١٨٠٥، مايو و يونيو،٢٠٠٨م۔
٣٤ـ صحيفة" المحجة"، فاس، المغرب، الأعداد: ٣١٢—٣٢٧، فبراير—نوفمبر ، ٢٠٠٩م۔
٣٥ـ عالم عربی کا المیہ/ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ٢٠٠٧ء۔